قرآنیات

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ طٰہٰ

(۴)

(گذشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيۡكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ مَا قَدۡ سَبَقَ وَقَدۡ اٰتَيۡنٰكَ مِنۡ لَّدُنَّا ذِكۡرًا ﴿۹۹﴾
مَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡهُ فَاِنَّهٗ يَحۡمِلُ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ وِزۡرًا ﴿۱۰۰﴾ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهِ وَسَآءَ لَهُمۡ يَوۡمَ
الۡقِيٰمَةِ حِمۡلًا ﴿۱۰۱﴾ يَّوۡمَ يُنۡفَخُ فِى الصُّوۡرِ وَنَحۡشُرُ الۡمُجۡرِمِيۡنَ يَوۡمَئِذٍ زُرۡقًا ﴿۱۰۲﴾

اِسی طرح، (اے پیغمبر)، ہم تمھیں ماضی کی سرگذشتیں سناتے ہیں[126] اور اِس کے لیے ہم نے خاص اپنے پاس سے تم کو ایک یاددہانی عطا فرما دی ہے[127]۔ جو اِس سے منہ موڑیں گے، وہ قیامت کے دن ایک بھاری بوجھ اٹھائیں گے[128] اور ہمیشہ اُسی کے وبال میں رہیں گے، اور قیامت کے دن وہ اُن کے لیے بہت برا بوجھ ہو گا۔ جس دن صور پھونکا جائے گا[129] اور مجرموں کو ہم اُس دن اِس حال میں اکٹھا کریں

۱۲۶؎ یعنی جس طرح پیچھے موسیٰ علیہ السلام کی سرگذشت سنائی ہے۔

۱۲۷؎ یعنی قرآن مجید۔

۱۲۸؎ اِس لیے کہ وہ اُن کی گم راہی کا بوجھ بھی ہو گا اور اُن لوگوں کی گم راہی کا بوجھ بھی جو اُن کے گم راہ کرنے سے گم راہ ہوئے۔

يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ﴿۱۰۳﴾ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ﴿۱۰۴﴾

گے کہ (خوف کے مارے) اُن کی آنکھیں نیلی پڑی ہوں گی۔ وہ چپکے چپکے آپس میں کہتے ہوں گے کہ تم (دنیا میں) مشکل سے دس دن رہے ہو گے[۱۳۰]۔ ہمیں خوب معلوم ہے جو کچھ وہ کہیں گے، جب کہ اُن میں سے جو (اُن کے خیال میں) سب سے بہتر اندازہ لگانے والا ہو گا، وہ کہے گا کہ تم ایک دن سے زیادہ نہیں رہے ہو۔ ۹۹-۱۰۴

۱۲۹؎ اصل الفاظ ہیں: 'يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ'۔ اِس میں مجہول کا صیغہ صورت حال کی ہول ناکی کی تعبیر کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُس کی ہول ناک آواز سے ہر طرف ہلچل تو برپا ہو جائے گی، لیکن پوچھنے والے پوچھ رہے ہوں گے اور اُنھیں معلوم نہ ہو گا کہ یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ یہ صور وہی چیز ہے جسے ہماری زبان میں نرسنگھا، بوق یا قرنا کہا جاتا ہے۔ اِس کی اصل حقیقت کو جاننا تو کسی کے لیے ممکن نہیں ہے، اِس لیے کہ اِس کا تعلق امور متشابہات سے ہے۔ تاہم جو لفظ اِس کے لیے اختیار کیا گیا ہے، اِس کا کچھ تصور اُس سے قائم کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی کائنات کے نظم کو سمجھانے کے لیے وہی الفاظ و اصطلاحات استعمال کرتے ہیں جو خود انسانوں کے ہاں اُس سے ملتے جلتے نظم کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ اِس سے مقصود ہمارے تصور کو اصل چیز کے قریب لے جانا ہوتا ہے، نہ یہ کہ ہم اُس چیز کو بعینہٖ اُس طرح سمجھ لیں، جس طرح وہ دنیا میں پائی جاتی ہے۔ قدیم ایام میں شاہی جلوس یا اعلان جنگ وغیرہ کے موقع پر نرسنگھا پھونکا جاتا تھا۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی ہی ایک چیز قیامت برپا کرنے کے لیے بھی پھونکی جائے گی، جس کی نوعیت ہمارے نرسنگھے جیسی ہو گی۔ اِس سے تمام مخلوقات پر شدید گھبراہٹ اور ہول کی کیفیت طاری ہو گی، لوگوں کو اپنی عزیز ترین چیزوں تک کا ہوش نہ رہے گا، جنگلوں کے جانور بدحواس ہو کر اکٹھے ہو جائیں گے، یہاں تک کہ اُس کی ہول ناک آواز سے تمام مخلوقات بے ہوش ہو جائیں گی۔

۱۳۰؎ یعنی جس کو آج بہت دور کی چیز سمجھتے اور 'حديث خرافة' کہتے ہیں، اُس وقت اُس کے بارے میں اِس طرح کے اندازے لگا رہے ہوں گے۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ﴿۱۰۵﴾ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ﴿۱۰۶﴾ لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا ﴿۱۰۷﴾ يَوْمَئِذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ﴿۱۰۸﴾ يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا ﴿۱۰۹﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ﴿۱۱۰﴾ وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ

وہ تم سے پہاڑوں کے بارے میں پوچھتے ہیں (کہ اُس دن اُن کا کیا بنے گا[۱۳۱])؟ تو کہو کہ میرا رب اُن کو دھول بنا کر اڑا دے گا، پھر زمین[۱۳۲] کو چٹیل میدان بنا کر چھوڑ دے گا کہ تم اُس میں کوئی موڑ اور کوئی ٹیلا نہ دیکھو گے۔ اُس دن سب پکارنے والے کے پیچھے چل پڑیں گے، اُس سے ذرا اِدھر اُدھر نہ ہو سکیں گے اور تمام آوازیں خدائے رحمٰن کے آگے پست ہو جائیں گی، سو تم ایک دبی دبی سرگوشی کے سوا کچھ نہ سنو گے۔ اُس دن شفاعت نفع نہ دے گی[۱۳۳]، الّا یہ کہ رحمٰن کسی کو اجازت دے اور اُس کے لیے کوئی بات کہنا پسند کرے۔ (اِس لیے کہ) وہ اُن کے آگے اور پیچھے جو کچھ ہے، اُس کو جانتا ہے اور اُن کا علم اُس کا احاطہ نہیں کر سکتا[۱۳۴]۔ سب کے چہرے اُس حی و قیوم کے

۱۳۱؎ اہل عرب کا عام خیال تھا کہ ہر چیز فنا ہو سکتی ہے، مگر سر بہ فلک پہاڑ فنا نہیں ہو سکتے۔ زہیر جیسا حکیم شاعر بھی کہتا تھا کہ حوادث روزگار کے مقابل میں کوئی چیز بھی قائم و دائم نہیں رہ سکتی، 'إلا الجبال الرواسیا'۔ یہ سوال اِسی مغالطے کی بنا پر اور طنز اور مذاق کے انداز میں کیا جاتا تھا۔

۱۳۲؎ اصل میں 'ھَا' کی ضمیر ہے، جس کا مرجع بالکل ظاہر ہے۔ یہ عربی زبان کا معروف اسلوب ہے۔ زمین و آسمان کے لیے اِس طرح ضمیریں قرآن میں متعدد مقامات پر آئی ہیں۔

۱۳۳؎ یہ اہل عرب کی مزعومہ شفاعت کی تردید ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اُن کا زعم یہ تھا کہ وہ جن معبودوں کو پوجتے ہیں، وہ خدا کے لاڈلے اور چہیتے ہیں۔ وہ خود آگے بڑھ کر اپنے پجاریوں میں سے جس کے لیے چاہیں گے، سفارش کریں گے اور اُس کو خدا سے چھڑا لیں گے۔''

(تدبر قرآن ۵/ ۹۲)

ظُلۡمًا ﴿۱۱۱﴾ وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلۡمًا وَّلَا هَضۡمًا ﴿۱۱۲﴾ وَكَذٰلِكَ اَنۡزَلۡنٰهُ قُرۡاٰنًا عَرَبِيًّا وَّصَرَّفۡنَا فِيۡهِ مِنَ الۡوَعِيۡدِ لَعَلَّهُمۡ يَتَّقُوۡنَ اَوۡ يُحۡدِثُ لَهُمۡ ذِكۡرًا ﴿۱۱۳﴾ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الۡمَلِكُ الۡحَقُّ وَلَا تَعۡجَلۡ بِالۡقُرۡاٰنِ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ يُّقۡضٰٓى اِلَيۡكَ وَحۡيُهٗ

سامنے جھکے ہوں گے۔[۱۳۵] (اُس دن) نامرادی ہے اُن کے لیے جو ظلم[۱۳۶] کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہوں۔ اِس کے برخلاف جو نیک عمل کرے گا اور اِس کے ساتھ ایمان بھی رکھتا ہوگا، اُس کو، البتہ (اُس دن) کسی زیادتی اور کسی حق تلفی کا اندیشہ نہ ہوگا۔ ۱۰۵-۱۱۲

ہم نے، (اے پیغمبر)، اِس یاددہانی کو اِسی طرح عربی قرآن کی صورت میں اتارا ہے[۱۳۷] اور اِس میں اپنی وعید طرح طرح سے بیان کر دی ہے تاکہ یہ لوگ خدا کے غضب سے بچیں یا اِن کے اندر وہ کچھ سوچ پیدا کر دے۔ سو برتر ہے اللہ، بادشاہ حقیقی۔ (وہ اپنی حکمت کے مطابق اِس کو اُسی تدریج سے اتارے گا جو اُس نے مقرر کر دی ہے)۔ اور دیکھو تم اپنی طرف اِس کی وحی کے پورا ہو جانے سے پہلے

۱۳۴؎ یعنی جب لوگوں کے ماضی اور مستقبل کی ہر چیز سے وہ خود واقف ہے اور کوئی دوسرا اُس کے علم کے کسی حصے کو بھی اُس کی مرضی کے بغیر اپنی گرفت ادراک میں نہیں لے سکتا تو سفارش کس بنا پر کی جائے گی؟ کیا کوئی شخص اِس لیے سفارش کرے گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی معلومات میں اضافہ کر سکتا ہے؟

۱۳۵؎ یعنی عام لوگ تو ایک طرف، جن کے بارے میں گمان کرتے ہو کہ خدا کے ہاں اُنھیں ناز و تدلل کا مقام حاصل ہے اور اِسی بنا پر وہ اُس سے جو چاہیں گے، منوا لیں گے، وہ بھی اُس روز خشیت و تذلل کے ساتھ سر جھکائے کھڑے ہوں گے اور جانتے ہو کس کے سامنے؟ اُس ہستی کے سامنے جو کوئی خاموش علۃ العلل نہیں ہے، بلکہ زندہ خدا ہے اور اپنی کائنات کا نظم خود سنبھالے ہوئے ہے۔

۱۳۶؎ 'ظُلم' کا لفظ قرآن میں اِس طریقے سے آئے، جس طریقے سے یہاں آیا ہے تو اِس سے شرک مراد ہوتا ہے۔

۱۳۷؎ یعنی اِسی تذکیر و نصیحت اور انذار و بشارت کا حامل بنا کر عربی زبان میں اتارا ہے، اِس لیے کہ جن لوگوں پر اتمام حجت کے لیے یہ نازل کیا گیا ہے، اُن کی زبان عربی ہے۔ چنانچہ ہم نے عنایت فرمائی ہے کہ خود اُن کی

وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓی اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَةِ

اِس قرآن کو پانے کی جلدی نہ کرو، اور دعا کرتے رہو کہ پروردگار، میرا علم زیادہ کر دے[۱۳۸]۔ ۱۱۳-۱۱۴

(اِس لیے کہ تم جس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے بھیجے گئے ہو، وہ ایک بھاری ذمہ داری ہے[۱۳۹])۔ ہم نے اِس سے پہلے آدم پر ایک عہد کی ذمہ داری ڈالی تھی تو وہ بھول گیا تھا اور ہم نے اُس میں ارادے کی پختگی نہیں پائی تھی[۱۴۰]۔ یاد کرو، جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو

زبان میں اُن پر اپنی حجت پوری کر دی ہے تاکہ اب جو فیصلہ اُن کے لیے صادر ہونے والا ہے، اُس کے خلاف اُن کے پاس کوئی عذر پیش کرنے کے لیے باقی نہ رہے۔

۱۳۸؎ اپنی قوم پر اتمام حجت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فریضۂ منصبی تھا۔ اِس طرح کی غیر معمولی ذمہ داری کو جلد سے جلد اور سرخ روئی کے ساتھ پورا کرنے کی خواہش ایک فطری خواہش تھی۔ پھر قریش بھی بار بار تقاضا کرتے تھے کہ قرآن اگر خدا کی طرف سے نازل کیا جا رہا ہے تو ایک ہی مرتبہ پورا کیوں نازل نہیں کر دیا جاتا۔ قرآن جیسی بے نظیر کتاب کسی شخص کو کائنات کے بادشاہ اور جہانوں کے پروردگار کی طرف سے دی جا رہی ہو اور اُس کے اندر یہ خواہش پیدا ہو جائے کہ پوری کتاب جلد اُسے مل جائے تو اِس پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔ آپ کے قلب کو تمام قوت، روح کو زندگی، عقل کو رہنمائی اور ارادے کو ثبات و استحکام قرآن ہی سے حاصل ہوتا تھا، یہ چیز بھی اُس کو جلد پا لینے کے لیے شوق و اضطراب کا باعث بن جاتی تھی۔ اِس آیت میں اِسی بے قراری اور عجلت پر صبر و انتظار کی تلقین کی گئی ہے۔

۱۳۹؎ یعنی یہ ذمہ داری کہ قوم پر اتمام حجت کے بعد اُس کا فیصلہ کر دیا جائے۔

۱۴۰؎ انسان کی یہی کم زوری ہے، جس سے وہ حدود سے تجاوز کرتا اور گناہ میں مبتلا ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پیچھے موسیٰ علیہ السلام کی عجلت کا نتیجہ دیکھ چکے ہو۔ تمھارے باپ آدم سے بھی یہی غلطی ہوئی تھی۔ وہ بھی حیات ابدی کو پانے کے لیے جلدی کے راستے پر چل پڑے تھے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ انسان جس چیز کے لیے جد و جہد کرتا ہے، اُس کا نتیجہ بہت جلد دیکھنا چاہتا ہے، لیکن اِسی میں بسا اوقات اپنی راہ کھوٹی کر بیٹھتا ہے۔ اِس لیے جتنا قرآن نازل ہوتا جائے، اُسی کو اپنی قوم کے سامنے پیش کرو۔ اِس کتاب کا جو حصہ جس وقت نازل ہونا

اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰى ﴿۱۱۶﴾ فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا

سجدہ کرو[۱۴۱] تو وہ سجدہ ریز ہو گئے، مگر ابلیس نہیں مانا[۱۴۲]، اُس نے انکار کر دیا۔ اِس پر ہم نے کہا کہ اے آدم، یہ تمھارا اور تمھاری بیوی کا دشمن ہے[۱۴۳] تو ایسا نہ ہو کہ یہ تم دونوں کو اِس باغ[۱۴۴] سے نکلوا دے، پھر تم محروم ہو کر رہ جاؤ۔ یہاں تو تمھیں یہ آسایش ہے کہ نہ اِس میں بھوکے رہتے ہو نہ

چاہیے، وہ اُسی وقت نازل ہو گا اور اِس کا فیصلہ اللہ، بادشاہ حقیقی کرے گا۔ اِس کے لیے کسی جلدی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسا کرو گے تو اندیشہ ہے کہ کوئی ابلیس یا کوئی سامری اِس سے فائدہ اٹھا کر لوگوں کو فتنے میں مبتلا کر دے گا۔

۱۴۱؎ یہ سجدہ تعظیم کے لیے تھا اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوا، اِس لیے اِس میں شرک کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی اطاعت کا یہ امتحان جس وجہ سے لیا، وہ یہ تھی کہ اولاً، آدم پر واضح ہو جائے کہ اصلی سرفرازی نور یا نار سے پیدا ہونے میں نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری میں ہے، لہٰذا اُسے بھی اپنی انانیت کو ایک طرف رکھ کر ہمیشہ حق کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا چاہیے۔ ثانیاً، وہ یہ سمجھ لے کہ اُسے جب اللہ تعالیٰ نے یہ درجہ دیا ہے کہ فرشتوں نے اُس کو سجدہ کیا تو یہ بات کسی طرح اُس کے شایان شان نہیں ہے کہ وہ کسی برتر مخلوق کو بھی خدا کا شریک سمجھ کر اُس کی پرستش کرے۔ بندگی اور پرستش اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے۔ وہ اگر اِس حق میں کسی کو شریک کرتا ہے تو صرف اللہ تعالیٰ کی اہانت نہیں کرتا، بلکہ خود اپنی بھی اہانت کرتا ہے۔

۱۴۲؎ قرآن کی سورۂ کہف (۱۸) میں صراحت ہے کہ ابلیس جنات میں سے تھا، اِس لیے یہ استثنا دلیل ہے کہ جنات چونکہ اپنی خلقت کے لحاظ سے فرشتوں سے زیادہ دور نہیں ہیں، اِس لیے اُنھیں جب سجدے کا حکم دیا گیا تو علیٰ سبیل التغلیب جنات بھی اُس میں شامل تھے۔

۱۴۳؎ یہ اِس لیے فرمایا کہ ذریت آدم سے ابلیس کی دشمنی اُس چیلنج سے واضح ہو گئی تھی جو اُس نے سجدے سے انکار کے بعد دیا تھا۔ سورۂ اعراف (۷) کی آیات ۱۶-۱۷ میں ہے کہ اُس نے کہا تھا کہ میں اولاد آدم کے لیے تیری سیدھی راہ پر گھات میں بیٹھوں گا۔ پھر اُن کے آگے اور پیچھے، دائیں اور بائیں، ہر طرف سے اُن پر تاخت کروں گا اور تو اُن میں سے اکثر کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا۔

تَعۡرٰی ﴿۱۱۸﴾ وَاَنَّكَ لَا تَظۡمَؤُا فِيۡهَا وَلَا تَضۡحٰی ﴿۱۱۹﴾ فَوَسۡوَسَ اِلَيۡهِ الشَّيۡطٰنُ قَالَ يٰۤاٰدَمُ هَلۡ اَدُلُّكَ عَلٰی شَجَرَةِ الۡخُلۡدِ وَمُلۡكٍ لَّا يَبۡلٰی ﴿۱۲۰﴾ فَاَكَلَا مِنۡهَا فَبَدَتۡ

لباس کی ضرورت ہوتی ہے، نہ تم کو اِس میں پیاس ستاتی ہے نہ دھوپ لگتی ہے[۱۴۵]۔ لیکن شیطان نے اُس کو ورغلایا۔ اُس نے کہا: آدم، میں تم کو وہ درخت بتاؤں جس میں ہمیشہ کی زندگی ہے اور اُس بادشاہی کا پتا دوں جس پر کبھی زوال نہ آئے گا؟[۱۴۶] سو (اُس کی ترغیب سے آدم وحوا)، دونوں نے اُس درخت کا پھل کھا لیا[۱۴۷]

۱۴۴؎ یہ غالباً اِسی دنیا کا کوئی باغ تھا جسے آدم وحوا کا مستقر قرار دیا گیا۔ اِس میں جو امتحان اُنھیں پیش آیا، اُس سے دونوں پر یہ بات واضح ہوگئی کہ شیطان اُن پر حملہ کرے گا تو کہاں سے کرے گا۔

۱۴۵؎ یہ الفاظ اپنے لازم کے لحاظ سے استعمال ہوئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ باغ میں اور ایسے معتدل موسم کی جگہ پر ٹھیرائے گئے ہو کہ سردی اور گرمی، دونوں کے آزار سے محفوظ رہتے ہو۔ چنانچہ جو کچھ میسر ہے، وہی کفایت کرتا ہے، زندگی کو قائم رکھنے کے لیے کسی غیر معمولی اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...سردی کے آزار میں سے بھوک اور عریانی ہے اور گرمی کی تکالیف میں سے پیاس اور دھوپ۔ جن لوگوں کی نظر اہل عرب کے کلام پر ہے، وہ جانتے ہیں کہ وہ بسا اوقات سردی اور گرمی کی تکالیف کا ذکر اِسی طرح کے الفاظ سے کرتے ہیں۔ بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ پیاس کا ذکر بھوک کے ساتھ اور دھوپ کا ذکر عریانی کے ساتھ زیادہ موزوں ہوتا۔ ہمارے نزدیک یہ رائے عربیت کے ذوق سے محرومی کا نتیجہ ہے۔'' (تدبر قرآن ۹۸/۵)

۱۴۶؎ یہ الفاظ بتا رہے ہیں کہ لفظ 'شَجَرَة' یہاں مجازی مفہوم میں ہے اور اِس سے مراد وہی شجرۂ تناسل ہے، جس کا پھل کھانے ہی سے انسان اِس دنیا میں اپنے آپ کو باقی رکھے ہوئے ہے۔ چنانچہ ابلیس نے یہ لالچ دے کر آدم وحوا کو اُس درخت کا پھل کھانے کی ترغیب دی کہ حیات جاوداں اور ابدی بادشاہی کا راز اِسی درخت کے پھل میں ہے، جس سے تمھیں محروم کر دیا گیا ہے۔ اِس کا پھل کھاؤ گے تو باقی رہو گے، ورنہ جلد یا بدیر موت سے دوچار ہو جاؤ گے۔ شیطان کی یہ بات، اگر غور کیجیے تو ایسی غلط بھی نہیں تھی، اِس لیے کہ یہ اِسی درخت کا پھل ہے، جس کے کھانے سے انسان کی زندگی کا تسلسل دنیا میں قائم ہے۔

۱۴۷؎ اِس پر تعجب نہ ہونا چاہیے، اِس لیے کہ اِس پھل کی خواہش میں جو غیر معمولی کیفیت انسان پر طاری ہو جاتی ہے، اُس سے مغلوب ہو کر وہ آج بھی اِس کے بارے میں خدا کی ہدایت کو بھول جاتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ﴿۱۲۲﴾ قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا ۢ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴿۱۲۳﴾

تو اُن کی پردے کی چیزیں اُن پر ظاہر ہو گئیں[۱۴۸] اور (اُن کو چھپانے کے لیے) وہ دونوں اپنے اوپر اُس باغ کے پتے گانٹھنے لگے[۱۴۹]۔ اِس طرح آدم نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی اور راہ راست سے بھٹک گیا۔ پھر اُس کے پروردگار نے اُس کو برگزیدہ کیا[۱۵۰]۔ سو اپنی عنایت سے اُس کی توبہ قبول فرمائی[۱۵۱] اور اُسے راستہ دکھا دیا[۱۵۲]۔ فرمایا: تم دونوں فریق یہاں سے اتر جاؤ، اکٹھے[۱۵۳]۔ تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے[۱۵۴]۔ پھر میری طرف سے اگر کوئی ہدایت تمھارے پاس آئے تو اُس کی پیروی کرو، اِس لیے کہ جو میری

۱۴۸؎ یعنی اُن کے بارے میں یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ صرف رفع حاجت کا ذریعہ نہیں ہیں، بلکہ ایک دوسری چیز بھی اِن کے اندر چھپی ہوتی ہے جو اِن کا پھل کھانے کے بعد ہی کھلتی ہے۔

۱۴۹؎ اِس سے واضح ہے کہ جنس اور جنسی اعضا کے ساتھ شرم کا احساس انسان کی فطرت میں ودیعت ہے۔ یہ کوئی اکتسابی چیز نہیں ہے اور نہ تہذیب کے ارتقا سے مصنوعی طور پر پیدا ہوئی ہے، بلکہ ایک ایسا احساس ہے جو خدا نے انسان کے اندر الہام کر دیا ہے۔ جنس کے معاملات سے واقف ہوتے ہی یہ آپ سے آپ نمایاں ہو جاتا ہے۔ چنانچہ انسان اپنے اُن اعضا کو ڈھانکنے کی کوشش کرتا ہے جو اُس کے لیے جنسی تلذذ کا ذریعہ بنتے ہیں۔

۱۵۰؎ یعنی اپنے کار خاص کے لیے منتخب کر لیا۔ چنانچہ توبہ کی توفیق دی اور توبہ جن الفاظ میں کرنی چاہیے، وہ بھی از راہ عنایت القا فرما دیے۔ سورۂ اعراف (۷) کی آیت ۲۳ میں توبہ کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں۔ اِن سے واضح ہے کہ آدم علیہ السلام سے جب لغزش ہوئی تو اُس کے فوراً بعد ہی وہ سخت نادم ہو گئے تھے۔ لہٰذا یہی چیز توفیق توبہ اور نتیجے کے طور پر نبوت کے لیے انتخاب الٰہی کا باعث بن گئی۔

۱۵۱؎ اصل الفاظ ہیں: 'فَتَابَ عَلَيْهِ'۔ اِن میں 'عَلٰی' اِس بات پر دلیل ہے کہ یہ 'أقبل' کے مفہوم پر متضمن ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا التفات اور توجہ اُس کو پھر حاصل ہو گئی۔

۱۵۲؎ یعنی آگے کے مراحل کے لیے راستہ دکھا دیا تاکہ وہ شیطان کے فتنوں کا مقابلہ کر سکے۔

۱۵۳؎ یہ خطاب آدم و حوا سے نہیں ہے، بلکہ آدم اور ابلیس سے بحیثیت دو فریقوں کے ہے۔ آیت میں لفظ

وَمَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِكۡرِىۡ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيۡشَةً ضَنۡكًا وَّنَحۡشُرُهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ اَعۡمٰى ﴿۱۲۴﴾

ہدایت کی پیروی کرے گا، وہ نہ گم راہ ہو گا نہ محروم رہے گا۔[۱۵۵] اور جو میری یاد دہانی سے منہ موڑے گا تو اُس کے لیے تنگی کی زندگی ہے[۱۵۶] اور قیامت کے دن ہم اُس کو اندھا اٹھائیں گے۔[۱۵۷]

'جَمِيۡعًا' کی تاکید اِس کو بالکل واضح کر دیتی ہے۔ دوسرے مقامات میں اِسی بنا پر جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔

۱۵۴؎ ابلیس نے قیامت تک کے لیے اپنی دشمنی کا اعلان کر رکھا ہے۔ اِس کا لازمی نتیجہ ہے کہ اولاد آدم بھی اگر بالکل ہی احمق اور ناعاقبت اندیش نہیں ہو گی تو اُسے اپنا دشمن ہی سمجھے گی۔ یہ اِسی حقیقت کا بیان ہے۔

۱۵۵؎ یہ اُس ہدایت کا ذکر ہے جو وحی کے ذریعے سے حاصل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے کہ اُس نے عقل و فطرت کی ہدایت کے ساتھ یہ ہدایت بھی انسان کو عطا فرمائی تاکہ شیطان کی ترغیبات کے مقابلے میں وہ ٹھیک اُس راستے پر قائم رہے، جس کی منزل خدا کی جنت ہے۔ یہ ہدایت سب سے پہلے خود آدم علیہ السلام کو دی گئی اور وہ اِسی مقصد سے نبی بنائے گئے۔ اِس کے لیے، ظاہر ہے کہ اُن کے حالات کے لحاظ سے کوئی شریعت بھی اللہ تعالیٰ نے اُنھیں لازماً دی ہو گی۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۱۵۶؎ یعنی ایسی زندگی ہے جو سکون و طمانیت، شرح صدر اور فراغ خاطر سے محروم ہو گی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...انسان کے اندر ایک خلا ہے جو اللہ کے ایمان کے سوا اور کسی چیز سے نہیں بھر سکتا۔ اِس وجہ سے، جب تک اُس کو ایمان حاصل نہ ہو، کوئی دوسری چیز اُس کو تسلی و طمانیت سے بہرہ مند نہیں کر سکتی۔ دوسری چیزیں، خواہ وہ بظاہر کتنی ہی شان دار اور دل فریب کیوں نہ ہوں، وقتی بہلاوے کا کام تو دے سکتی ہیں، لیکن قلب و روح کی بے قراری کو رفع نہیں کر سکتیں۔ جب بچہ بھوک سے روتا ہے تو اُس کے منہ میں چسنی یا نپل دے کر کچھ دیر کے لیے بہلایا جا سکتا ہے، لیکن وہ آسودہ اُسی وقت ہوتا ہے، جب ماں اُس کو چھاتی سے لگاتی اور اُس کو دودھ پلاتی ہے۔ اِس کے بغیر اُس کی بے چینی نہیں جاتی۔ یہی حال انسان کا ہے۔ وہ اپنے لیے جو اسباب و سامان بھی مہیا کر لے، لیکن اگر وہ خدا کے ایمان سے محروم ہے تو وہ غیر مطمئن، ڈانواں ڈول، اندیشہ ناک، مضطرب اور اندرونی خلفشار میں مبتلا رہے گا، اگرچہ وہ اپنی نمایشوں سے اُس پر کتنا ہی پردہ ڈالنے کی کوشش کرے۔ نفس مطمئنہ کی بادشاہی صرف سچے اور پکے ایمان ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ 'اَلَا بِذِكۡرِ اللّٰهِ تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡبُ'۔

ممکن ہے، کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ بہت سے لوگ ایمان کے مدعی ہوتے ہیں، لیکن اُن کی زندگی نہایت پریشان حالی و پراگندہ بالی کی ہوتی ہے۔ برعکس اِس کے کتنے ہیں جو خدا کو محض ایک وہم سمجھتے ہیں، لیکن وہ

قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِیْٓ اَعْمٰی وَقَدْ كُنْتُ بَصِیْرًا ﴿۱۲۵﴾قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰیٰتُنَا فَنَسِیْتَهَا وَكَذٰلِكَ الْیَوْمَ تُنْسٰی ﴿۱۲۶﴾وَكَذٰلِكَ نَجْزِیْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ یُؤْمِنْۢ بِاٰیٰتِ رَبِّهٖ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰی ﴿۱۲۷﴾

اَفَلَمْ یَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ یَمْشُوْنَ فِیْ مَسٰكِنِهِمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰی ﴿۱۲۸﴾وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ

وہ کہے گا: پروردگار، تو نے مجھے اندھا کیوں اٹھایا ہے، میں تو آنکھوں والا تھا۔ ارشاد ہوگا: ہماری آیتیں تمھارے پاس آئی تھیں تو تم نے اِسی طرح اُنھیں نظر انداز کر دیا تھا۔ آج تمھیں بھی اُسی طرح نظر انداز کر دیا جائے گا۔ ہم اُن کو جو حد سے گزر گئے اور اپنے پروردگار کی آیتوں پر ایمان نہیں لائے، اِسی طرح بدلہ دیں گے۔[۱۵۸] اور آخرت کا عذاب تو زیادہ سخت اور زیادہ دیرپا ہے۔ ۱۱۵-۱۲۷

پھر کیا اِن لوگوں کو اِس سے ہدایت نہیں ہوئی کہ اِن سے پہلے ہم کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں جن کی بستیوں میں اب یہ چلتے پھرتے ہیں؟[۱۵۹] حقیقت یہ ہے کہ اِس میں عقل والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ تمھارے پروردگار کی طرف سے، (اے پیغمبر)، اگر ایک بات پہلے طے نہ کر

بڑی بے فکری و طمانیت کی زندگی بسر کرتے ہیں؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ اول تو یہاں بحث ایمان کے مدعیوں سے نہیں، بلکہ حقیقی اہل ایمان سے ہے۔ ثانیاً، جن لوگوں کو خدا سے بے پروا ہونے کے باوجود ہم مطمئن خیال کرتے ہیں، ہم صرف اُن کے ظاہری کروفر کو دیکھتے ہیں۔ اگر کبھی اُن کے سینوں میں جھانک کر دیکھنے کا موقع ملے، تب معلوم ہو کہ اُن کے اندر کتنے خطرے اور کتنے خلجان چھپے ہوئے بیٹھے ہیں، لیکن یہ ہر ایک کو نظر نہیں آتے۔ اِن کو وہ خود دیکھتے ہیں یا وہ لوگ دیکھ سکتے ہیں جن کے اندر ایمانی بصیرت ہو۔'' (تدبر قرآن ۵/ ۱۰۳)

۱۵۷؎ یہ اندھا پن باعتبار نتیجہ ہوگا، یعنی اگرچہ دیکھ رہے ہوں گے، مگر اُس نور سے محروم ہوں گے جو اُس روز اہل ایمان کے پاس ہوگا اور اُس کی روشنی میں وہ ہر مرحلے پر اپنا جادہ و منزل اپنے لیے متعین کر لیں گے۔ سورۂ حدید (۵۷) کی آیت ۱۳ میں اِس کی وضاحت ہو گئی ہے۔

۱۵۸؎ اشارہ ہے اُس تنگی کی طرف جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔

مُّسَمًّى ﴿۱۲۹﴾ فَاصۡبِرۡ عَلٰى مَا يَقُوۡلُوۡنَ وَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ قَبۡلَ طُلُوۡعِ الشَّمۡسِ وَقَبۡلَ غُرُوۡبِهَا وَمِنۡ اٰنَآئِ الَّيۡلِ فَسَبِّحۡ وَاَطۡرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرۡضٰى ﴿۱۳۰﴾ وَلَا

دی گئی ہوتی اور (مہلت کی) ایک مقرر مدت نہ ہوتی تو (جو رویہ انھوں نے اختیار کیا ہے، اُس کی پاداش میں اِن پر) لازماً عذاب آ جاتا۔ سو جو کچھ یہ کہتے ہیں، اُس پر صبر کرو اور اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کرتے رہو[۱۶۰]، سورج کے نکلنے اور اُس کے غروب ہونے سے پہلے[۱۶۱] اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح کرو[۱۶۲] اور دن کے کناروں پر بھی[۱۶۳]۔ اِس لیے کہ (اُس کے صلے میں خدا کی

۱۵۹؎ یہ عاد و ثمود وغیرہ کی اُن بستیوں کی طرف اشارہ ہے جن کے برباد شدہ آثار اور کھنڈروں پر سے قریش کے لوگ اپنے تجارتی سفروں میں برابر گزرتے رہتے تھے۔

۱۶۰؎ یہ ذکر کے پہلو سے نماز کی تعبیر ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...یہ ذکر دو عنصروں سے مرکب ہے: ایک 'تَسۡبِیۡح'، دوسرا 'حَمۡد'۔ 'تَسۡبِیۡح' میں تنزیہہ کا پہلو غالب ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کو اُن باتوں سے پاک و منزہ قرار دینا جو اُس کی شان کے منافی ہیں۔ 'حَمۡد' میں اثبات کا پہلو نمایاں ہے، یعنی اُس کو اُن صفات سے متصف قرار دینا جو اُس کے شایان شان ہیں۔ یہ نفی اور یہ اثبات، دونوں مل کر اللہ تعالیٰ کے صحیح تصور کو دل میں راسخ کرتے ہیں اور اِسی رسوخ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندے کا صحیح تعلق قائم ہوتا ہے جو تمام صبر و توکل کی بنیاد ہے۔ اگر اِن کے اندر کسی پہلو سے کوئی ضعف یا عدم توازن پیدا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کے متعلق آدمی کا تصور غلط ہو جاتا ہے اور یہ غلطی اُس کے سارے نظام فکر و عمل کو بالکل درہم برہم کر کے رکھ دیتی ہے۔'' (تدبر قرآن ۷/ ۵۶۷)

۱۶۱؎ یعنی فجر اور عصر کے وقت۔

۱۶۲؎ عشا اور تہجد کی نمازیں رات میں پڑھی جاتی ہے۔ یہ اُس کی طرف اشارہ ہے۔ آیت میں فعل کا اعادہ تاکید پر دلالت کر رہا ہے۔

۱۶۳؎ یہ تین ہی ہو سکتے ہیں: ایک صبح، دوسرا زوال آفتاب اور تیسرا شام کا کنارہ۔ چاشت، ظہر اور مغرب کی نمازیں دن کے اِنھی کناروں پر ادا کی جاتی ہیں۔

نماز کی یہ ہدایت صبر حاصل کرنے کی ایک تدبیر کے طور پر ہوئی ہے، اِس لیے کہ صبر کی توفیق جس کو بھی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تَمُدَّنَّ عَيۡنَيۡكَ اِلٰى مَا مَتَّعۡنَا بِهٖۤ اَزۡوَاجًا مِّنۡهُمۡ زَهۡرَةَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا لِنَفۡتِنَهُمۡ فِيۡهِ وَرِزۡقُ رَبِّكَ خَيۡرٌ وَّاَبۡقٰى ﴿۱۳۱﴾ وَاۡمُرۡ اَهۡلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصۡطَبِرۡ عَلَيۡهَا لَا نَسۡـَٔـلُكَ

عنایتوں سے) نہال ہو جاؤ[۱۶۴]۔ اور اِن کے بعض گروہوں کو دنیوی زندگی کی رونق[۱۶۵] کا جو ساز و سامان ہم نے اُس میں اُن کی آزمایش کے لیے دے رکھا ہے[۱۶۶]، اُس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو[۱۶۷] اور (یاد رکھو کہ) تمھارے پروردگار کا رزق ہی بہتر ہے اور وہی باقی رہنے والا ہے[۱۶۸]۔ تم اپنے لوگوں کو[۱۶۹] نماز

حاصل ہوتی ہے، اللہ کی مدد سے حاصل ہوتی ہے اور اللہ کی مدد حاصل کرنے کا واحد ذریعہ نماز ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...یہ آیات حق و باطل کی کشمکش کے نہایت مشکل دور میں نازل ہوئی ہیں۔ اِن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے واسطے سے امت کو وہ تدبیر بتائی گئی ہے جو مشکلات و مصائب میں ثابت قدم رکھنے والی اور خدا کی رحمت و نصرت کا حق دار بنانے والی ہے۔ اِس طرح کے حالات میں صرف فرض نمازوں ہی کا اہتمام مطلوب نہیں ہے، بلکہ نوافل کا اہتمام بھی مطلوب ہے۔ قرآن، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور سلف صالحین کے عمل، ہر چیز سے ہمارے اِس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ عام حالات میں تو تہجد و اشراق کی نمازوں کی حیثیت بہرحال نفلی نمازوں ہی کی ہے، لیکن مشکلات و مصائب میں، خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی، اِن کا اہتمام ضروری ہے۔''

(تدبر قرآن ۵/۱۰۷)

۱۶۴؎ اِن دو لفظوں کے اندر بشارتوں کی جو دنیا چھپی ہوئی ہے، اُس کا اندازہ ہر صاحب ذوق کر سکتا ہے۔

۱۶۵؎ اصل میں 'زَهۡرَةَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ 'مَتَّعۡنَا بِهٖ' میں 'بِهٖ' کی ضمیر مجرور سے حال واقع ہوئے ہیں اور مجرور سے حال واقع ہونا فصیح عربی میں معروف ہے۔ بعض گروہوں سے اشارہ مکہ اور طائف کے اُن لوگوں کی طرف ہے جو وہاں عزت و اقتدار رکھتے تھے۔ اُن کے مال و دولت اور عزت و اقتدار کو 'زَهۡرَةَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا' کہہ کر قرآن نے اشارہ کر دیا ہے کہ جو کچھ اُن کے پاس ہے، اُس کی چمک دمک چند روزہ ہے۔

۱۶۶؎ یعنی اِس لیے نہیں دے رکھا کہ یہ اُس کے حق دار تھے، بلکہ اِس لیے دے رکھا ہے کہ اِن کا امتحان کریں کہ ہماری نعمتیں پا کر یہ شکر گزاری کا رویہ اختیار کرتے ہیں یا ہمارے آگے ہی اکڑنے لگتے ہیں۔

۱۶۷؎ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعوت کی محبت اور اِن لوگوں کے لیے سچے جذبۂ خیر خواہی و ہم دردی کی بنا پر

رِزۡقًا نَحۡنُ نَرۡزُقُكَ وَالۡعَاقِبَةُ لِلتَّقۡوٰى ﴿۱۳۲﴾

کی تلقین کرو اور خود بھی اُس کے پابند رہو۔ ہم (اُن کے لیے) تم سے کوئی رزق نہیں مانگتے (کہ تمھیں کسی کے ساز و سامان کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہو)[۱۷۱]۔ رزق تو ہم تمھیں دیں گے[۱۷۲] (ہم تم سے تقویٰ کا تقاضا کرتے ہیں[۱۷۳]) اور انجام کی فیروزمندی تقویٰ ہی کے لیے ہے۔ ۱۲۸-۱۳۲

اِن کے ایمان کے خواہاں تھے۔ قریش کے اِن اغنیا اور سادات و امرا کی طرف آپ کے التفات کا باعث یہی تھا، اِس میں کسی طمع و حرص کا، معاذ اللہ، کوئی شائبہ نہ تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اِس سے بھی روک دیا ہے، اِس لیے کہ اپنے گریز و فرار اور استکبار کی وجہ سے وہ دعوت کے اِس مرحلے میں اب اِس کے مستحق نہیں رہے تھے۔

۱۶۸؎ یعنی موت کے بعد بھی باقی رہنے والا ہے، بلکہ اُس لازوال اور ابدی بادشاہی کی صورت اختیار کرنے والا ہے، جس سے آگے کسی نعمت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

۱۶۹؎ اصل میں لفظ 'اَهۡلَكَ' آیا ہے۔ اِس سے وہ تمام لوگ مراد ہیں جو اُس وقت ایمان لا چکے تھے۔ عربی زبان میں لفظ 'أهل' اِس وسعت کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ یہاں اِس کے استعمال میں یہ بلاغت ہے کہ غربائے مسلمین کی عزت اِس سے اِس درجہ بڑھ گئی ہے کہ وہ گویا سرور عالم کے اہل میں شامل ہو گئے ہیں۔

۱۷۰؎ مطلب یہ ہے کہ ہم نے یہ تقاضا تم سے کبھی نہیں کیا کہ تم یہ خیال کرو کہ اِن لوگوں نے ایمان قبول نہ کیا تو ہماری دعوت اور اُس کو آگے بڑھ کر قبول کرنے والے غربائے مسلمین اِس سرزمین میں بے یار و مددگار ہو کر رہ جائیں گے۔ نہیں، اِن میں سے کسی چیز کو بھی خاطر میں لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اپنی دعوت اور اپنے ساتھیوں کے لیے اِن ناقدروں کی مدد اور سرپرستی کے محتاج نہیں ہو۔ تمھارے ساتھ خدا ہے اور تمھاری اور تمھارے ساتھیوں کی مدد، تقویت اور کفالت کے لیے وہی کافی ہے۔

۱۷۱؎ یعنی تمھیں بھی اور اُن کو بھی جو دعوت کے اِس کام میں تمھارے ساتھی بنیں گے۔ یہ ہمارا کام ہے اور ہم جب اپنا کوئی کام کسی کے سپرد کرتے ہیں تو اُس کے رزق کی ذمہ داری اِسی طرح اپنے اوپر لے لیتے ہیں۔ اِس لیے تم ہمارا کام کرو اور نماز کا اہتمام رکھو۔ باقی جو ذمہ داری ہماری ہے، اُس کو ہم پر چھوڑ دو۔ اُس کے لیے تمھیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اپنی ڈیوٹی پر ہو تو مسیح (علیہ السلام) کے الفاظ میں، اپنی مزدوری کے حق دار ہو۔

۱۷۲؎ یعنی علم و عمل میں بھی اور اُس کام میں بھی جو ہم نے تمھارے سپرد کیا ہے۔

وَقَالُوْا لَوْلَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِى الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿۱۳۳﴾ وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰى ﴿۱۳۴﴾ قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى ﴿۱۳۵﴾

اِنھیں اصرار ہے کہ اپنے پروردگار کے پاس سے یہ ہمارے لیے کوئی نشانی کیوں نہیں لاتے ؟ کیا اِن کے پاس اگلے صحیفوں میں جو کچھ ہے، اُس کی گواہی نہیں پہنچی[۱۷۳]؟ اگر ہم اِن کو اِس سے پہلے ہی کسی عذاب سے ہلاک کر دیتے تو یہ کہتے کہ پروردگار، تو نے ہمارے پاس کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ذلیل و رسوا ہونے سے پہلے[۱۷۴] ہم تیری آیتوں کی پیروی اختیار کر لیتے ؟ اِن سے کہو کہ ہر ایک منتظر ہے[۱۷۵] تو تم بھی انتظار کرو،[۱۷۶] پھر عنقریب جان لو گے کہ کون سیدھی راہ پر چلنے والا ہے اور کون برسرغلط ہے، اور کون منزل تک پہنچا اور کون راہ سے بھٹک گیا ہے[۱۷۷]۔ ۱۳۳-۱۳۵

۱۷۳؎ یہ جس سوال کا جواب ہے، وہ چونکہ اہل کتاب کا القا کیا ہوا تھا، اِس لیے جواب بھی اُنھی کو پیش نظر رکھ کر دیا ہے۔

۱۷۴؎ اصل الفاظ ہیں: 'مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَ نَخْزٰى'۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''ذلت' اور 'خزی' کے الفاظ اپنے عام استعمال میں ایک دوسرے کے مفہوم میں بھی آتے ہیں، لیکن جب یہ دونوں ایک ساتھ آئیں، جس طرح یہاں آئے ہیں تو اِن کے درمیان ایک نازک سا فرق ہو جاتا ہے۔ اِس صورت میں 'ذلت' سے مراد وہ ذلت ہوتی ہے، جس کا احساس ایک ذلیل ہونے والا خود اپنے باطن میں کرتا ہے اور 'خزی' سے وہ رسوائی مراد ہوتی ہے جو دوسروں کے سامنے اُس کو ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ نہ ہم اپنی نگاہوں ہی میں ذلیل ہوتے اور نہ دوسروں کے آگے ہی رسوائی اور فضیحتا کی یہ نوبت آتی۔'' (تدبر قرآن ۵/ ۱۱۲)

۱۷۵؎ یعنی ہم بھی اور وہ سب لوگ بھی جو اِس کشمکش کو دیکھ رہے ہیں۔

۱۷۶؎ یہ خطاب کا اسلوب شدت عتاب کے اظہار کے لیے ہے۔

۱۷۷؎ اِس جملے میں مقابل کے فقرے عربیت کے اسلوب پر محذوف ہیں۔ ہم نے اُنھیں کھول دیا ہے۔